زبان کو بیان کا یارا نہیں ہے، ضبط کی تاب نہیں۔

میں یہ کہہ کر چپ ہوا۔ پھر دل کو سنبھالا، حواس درست کیے اور جو مشاہدہ کیا تھا وہ بے کم و کاست بیان کیا۔

پدر عالی قدر نے یہ ماجرا سن تادیر سکوت اختیار کیے رکھا۔ پھر فرمایا کہ:

"جانِ پدر، ایک سانحہ کی دید نے تمہیں ہلا دیا۔ ادھر ان کو تمہارے گم کر دیا غور کی جائے ہے اور فکر کا مقام ہے کہ تمہارے اجداد نے کتنا کچھ دیکھا کہ اس کے دیکھے سے شیروں کا جگر پھٹ جائے مگر کسی ماجرے نے انکے حوصلہ کو پست نہیں کیا۔ کسی سانحہ سے ان کی کشتیٔ ہمت ڈانواڈول نہیں ہوئی۔"

یہ کلام سن کر میں حیران ہوا اور استفسار کیا کہ وہ کیسے ماجرے تھے کہ اجداد نے دیکھے اور جن کے سامنے یہ ماجرا جناب کو گرد نظر آتا ہے۔

پدر عالی مقام نے تامل کیا۔ پھر یوں گویا ہوئے کہ:

"اے فرزندِ ارجمند، ہم اصلاً اصفہان نصف جہان کی مٹی ہیں۔ ہمارے جدِ اعلیٰ خلد آشیاں احمد باللہ عزم و ہمت کا پیکر تھے، جود و سخا کا سمندر تھے۔ ان کا مسکن کہ بیت الابیض کہلاتا تھا اصفہان میں مرجع خلائق تھا۔ قریب و دور سے حاجتمند آتے تھے اور دامن بھر کر جاتے تھے۔ مگر تیموری غضب کی آندھی ایسی چلی کہ بھرا اصفہان اجڑ گیا۔ سیہ بختی نے بیت الابیض میں ڈیرا کیا۔ اب وہاں سناٹا تھا۔ جو انانِ جری کہ میدان کی طرف گئے تھے واپس نہیں آئے۔ سب کٹ گئے۔ ایک ایک کر کے بٹ گئے۔ سر ان کے کھوپڑیوں کے مینار کی زینت بن کر بلند ہوئے۔ تب ہمارے عالی قدر جد نے بصد وقار اپنے گھوڑوں اور ہتھیاروں پر ایک نظر ڈالی۔ خالی ایک تلوار

کمر سے باندھی اور اس اسپ باد فا پر سوار ہوئے جو رانوں کے بیچ آ کر بجلی کی مانند تڑپتا تھا اور ہوا سے باتیں کرتا تھا۔ زوجۂ محترمہ کو پیچھے اور کمسن فرزند کو آگے بٹھایا۔ بیت الابیض کے در و دیوار پر حسرت سے نظر کی اور نکل کھڑے ہوئے۔

جدِ عالی مرتبت کتنے دنوں خاک بسر بھرتے پھرے۔ صحراؤں کی خاک چھانی۔ جنگلوں کو کھوندا۔ رات کبھی کسی کھوہ میں گذاری۔ کبھی کسی جھاڑی تلے خاک کے بستر پہ بسر کی۔ آخر کے تئیں مرزبومِ قزوین پہ قدم رکھا۔ اس زمین نے قدم اس جناب کے پکڑ لیے اور دل کو موہ لیا۔ بس پھر اسی دیار میں ڈیرا ڈالا اور اس لاثانی قریے کو اصفہانِ ثانی جانا جو لعل اصفہان کی مٹی نے اگلا تھا وہ قزوین کی خاک میں آسودہ ہوا۔ پھر اگلی نسلیں اسی دیار میں پروان چڑھیں۔ بیٹے پوتے پڑپوتے خوب پھلے پھولے ان میں سب سے بڑھ کر ہمارے جدِ امجد حکیم علی شیر ریحان تھے کہ مسکن اس گھرانے کا اس جناب ہی کے نام سے منسوب ہوا اور قصرِ ریحان کے نام سے قریب و دور مشہور ہوا۔

قصرِ ریحان علما و فضلا کا مرجع تھا۔ دکھیاروں بیماروں کا ملجا تھا۔ واضح ہو کہ قزوین میں آ کر ہمارے اجداد نے شمشیر و سناں سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ شمشیر آبدار کہ جدِ عالی وقار، احمد باللہ زیب کمر کر کے بیت الابیض سے نکلے تھے اصفہان سے قزوین تک "رفیق و دمساز" رہا۔ راہ میں کتنی مرتبہ تاتاری رسالوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ہر مرتبہ اس شمشیر نے اپنے جوہر دکھائے۔ مگر جب اس جناب نے قزوین کی زمین پہ قدم رکھا تو تلوار کو کھول کر الگ رکھا اور بصد افسوس فرمایا کہ یہ تلوار اصفہان کی حفاظت نہ کر سکی اور بیت الابیض کو برباد ہونے سے نہ بچا سکی۔ سو اب تو قصہ اس کی کیا رہ گئی۔ اس کلام کے ساتھ شمشیر و سناں کو سلام کیا اور علم و فضل سے رشتہ استوار کیا۔

آگے اس گھرانے کا ہر فرد شجاعت میں فرد تھا۔ تلوار کا دھنی تھا۔ اب ہر فرزندِ خاندان علم و فضل میں یکتائے روزگار ٹھہرا۔ سب سے بڑھ کر جدِ امجد حکیم علی شیر ریحان تھے کہ

طب و حکمت کے بحر کے شناور تھے۔ بحیثیت طبیب جالینوس ثانی کہلائے گئے۔ بوعلی سینا کے مثیل ٹھہرائے گئے۔ یہ طبع عالی کو ظلم سے نفور تھا اور وہ زمانہ پُر فتور تھا۔ حاکم وقت کے ظلم سے خلقِ خدا پناہ مانگتی تھی۔ اس کے ظلم کی چکی اندھا دھند چلتی تھی کہ اپنے پرائے کو بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اس مردِ شوم کے چار بیٹے تھے۔ خلقت میں مقبول تھے۔ یہ دیکھ وہ ان سے خائف ہوا۔ ایک کو زہر دلوا دیا۔ دوسرے کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دی۔ تیسرے کی آنکھیں ثابت نکال لیں۔ چوتھے کو فرشتۂ قضا نے اچک لیا۔ اس کی دستبرد سے بچ گیا۔

واضح ہو کہ انہیں ایام میں جدِ بزرگوار نے اس طبیبِ بے مثال نے ایک سرمہ تیار کیا تھا کہ بینائی کسی صورت بھی زائل ہوئی ہو، اس کی ایک سلائی سے بحال ہو جاتی تھی۔ پر جن کی آنکھیں نکلوائی جاتی تھیں ان تک یہ سلائی کیسے پہنچتی کہ ان کے مقدر میں تو پھر بندی خانے کی تاریکی لکھی جاتی تھی۔

یہ حالات دیکھ کر جدِ عالی مقام کبیدہ خاطر ہوئے۔ آبدیدہ ہو کر بولے کہ افسوس ہے ہم پہ کہ بے بصر حاکم وقت کے ہاتھوں خلقت چشمِ بینا سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہم بیٹھے دیکھتے ہیں اور اپنی ایجاد پہ فخر کرتے ہیں۔ پھر آگے دھری ہوئی سرمہ دانی سے مخاطب ہوئے کہ اے سرمہ دانی اگر تو فرزندین کی بجھی آنکھوں کو روشن نہیں کر سکتی تو پھر کس کام کی؟ یہ کہہ کر سرمہ دانی الٹ دی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ چار مخطوطہ دربارۂ طب بغل میں داب، اہلِ خانہ کو ہمراہ لیا اور قصرِ ریحان کے در و دیوار کو ایک نظر دیکھ نکل کھڑے ہوئے۔

اس صاحبِ والا صفات نے اس نواح میں جس قریے میں قدم رکھا یہی دیکھا کہ خلقِ خدا معتوب و مقہور ہے۔ آنکھوں میں ان کے گرم سلائیاں پھیری جاتی ہیں۔ پتلیاں نکلوائی جاتی ہیں۔ ایک بدبخت حاکم نے بندی خانہ کے داروغہ کو بحالتِ غضب حکم دیا کہ جتنے باغی پابہ زنجیر ہیں اتنی پتلیوں کے جوڑے مابدولت کے حضور گن کر پیش کیے جائیں۔ ایک جوڑا بھی کم ہوا تو تیری پتلیاں نکلوا کر گنتی پوری کر دوں گا۔

یہ نقشہ دیکھ جدِ امجد نے اس نواح سے منہ موڑا اور دیارِ ہند کی راہ لی۔ جانِ پدر، یوں ہمارے اجداد اصفہان سے نکلے، قریہ قریہ پھرے اور جہان آباد میں آ کر ڈیرے ڈالے۔

پدرِ عالی قدر یہ کہہ کر خاموش ہوئے۔ پھر افسوس سے بولے: "حیف ہے اس بستی پر کہ یہ بھی اسی راہ پر چل نکلی ہے۔"

میں نے استفسار کیا کہ باعث اس فساد کا کیا ہے؟

فرمایا: "انسان ظالم ہے اور جاہل ہے"۔

تب میں نے بصد ادب یہ سوال کیا کہ اے میرے پدر، ایسا کیوں ہے کہ ظالم اور جاہل سب سے بڑھ کر امتِ مرحوم کے بیچ نمودار ہوتے ہیں۔ اس پر پدرِ بزرگوار نے سکوت اختیار کیا، پھر تین بار کہا:

"افسوس، افسوس، افسوس۔"

پھر آنکھیں موند لیں اور بحرِ سکوت میں غرق ہو گئے۔

عاصی پُر معاصی چراغ علی اس باب میں یوں کہتا ہے کہ جدِ امجد نے بجا فرمایا بیشک آدمی ظالم و جاہل ہے۔ کتنا کچھ دیکھتا ہے مگر عبرت حاصل نہیں کرتا ہے۔ ایک واقعہ اس باب میں یہ ہیچمدان تواریخ سے اخذ کر کے نقل کرتا ہے۔

روایت کیا ابوجعفر نے ابنِ ندیم سے اور ابنِ ندیم نے سنا اسحٰق زیتون فروش سے کہ زیتون کی اس کے شہرت دور دور تھی۔ دیانت اس کی قریہ قریہ مشہور تھی۔ اور اسحٰق زیتون فروش نے نقل کیا حارث عطار سے کہ مردِ باصفا تھا، صاحبِ زہد و اتقا تھا۔ اور حارث عطار نے استفادہ کیا بیان سے ابوبکر جلابی کے کہ علم کا سمندر تھے۔ احادیث و روایات کے شناور تھے اور ابوبکر جلابی نے شنید کیا زید بن عثمان زرگر سے کہ مردان الحمار قتل ہوا اور سر اس کا قلم کر کے طشت میں سجا کے عبداللہ بن علی کے روبرو پیش کیا گیا اور بعد اس کے وہ طشت ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اسی ہنگام ایک بلی حرام پلی سٹک کر

اس سر کے پاس پہنچی اور کسی ترکیب زبان اس کے بیچ سے نکال کر چبا گئی۔ دیکھنے والوں نے یہ دیکھا اور ششدر رہ گئے اور اس پر کہا عبداللہ بن علی نے کہ خدا کی قسم! میں نے زمانے کی عبرت ناکیوں اور وقت کی سفاکیوں میں اس واقعہ کو سب سے زیادہ عبرتناک اور سفاک پایا۔ اور فقیر چراغ علی اس بیچ یہ کہتا ہے کہ بے شک بلی جتنی مسکین ہوتی ہے اتنی ہی سفاک بھی ہوتی ہے۔ جائے غور ہے و نیز جائے عبرت کہ بنی امیہ کو جتنا گھمنڈ اپنی خلافت پہ تھا اتنا ہی غرہ اپنی خطابت پہ تھا مگر ایک گربہ مسکین مروان الحمار کی زبان چبا کر ان کی خلافت اور خطابت دونوں کو چاٹ گئی کہ بعد اس کے کسی اموی کو تختِ خلافت پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔

القصہ دنیا میں زق زق بق بق بغایت ہے؛ شور و غوغا غل غپاڑہ بے نہایت ہے بھائی کو بھائی سے عداوت ہے۔ زن زر اور زمین کے لیے خون خرابہ، شور شرابہ، نفسا نفسی، دھینگا مشتی، دَل فصل، جنگ و جدل، جینجم دھاڑ، داتا کلکل۔ مگر زندگی کا کیا اعتبار ہے دنیا ناپائدار ہے۔ یہاں کس چیز کو قرار ہے۔ ابھی تخت پر بیٹھے ہیں، ابھی تابوت میں لیٹے ہیں۔ زمانہ ابلقِ ایام پر سوار بگٹٹ دوڑتا ہے۔ نیک و بد کو نہیں دیکھتا ہے۔ بلا تمیز سب کو روندتا ہے۔ موت کی گرم بازاری ہے۔ آج ہم کل تمہاری باری ہے۔ قصہ مختصر دنیائے دوں میں حالت سب کی زبوں ہے۔ رنگِ گردوں ہر دم دگرگوں ہے۔ کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے۔ یہ ہیچ پوچ چراغ علی اپنی مثال لاتا ہے۔ ان دو آنکھوں نے اس عمر میں کیا کیا کچھ دیکھ لیا۔ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی۔ جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھتی ہیں۔ تیموری بساط کو لپٹتے دیکھا۔ جہان آباد کو اجڑتے دیکھا۔ تایا حضور کو دار پہ بلند ہوتے دیکھا اور اہل جہان آباد نے زیرِ آسمان کیا کیا دیکھا۔ جس بادشاہ کو تختِ شاہی پر لباسِ شاہانہ میں رونق افروز دیکھا تھا اسی کی ننگی لاش جمنا کی ریتی پہ پڑی دیکھی۔ تایا حضور نے ایک روز یہ احوال بیان کیا اور اتنا روئے کہ ریش مبارک ان کی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ ایسا ان پہ اثر ہوا

کہ جینے سے جی سرد ہوا، رنگ چہرے کا زرد ہوا۔ دنیا کے قصوں بکھیڑوں سے منہ موڑا، عیش و عشرت کی محفلوں کو، یار و احباب کی صحبتوں کو چھوڑا۔ خانہ نشین ہو گئے، مصلے پہ بیٹھ گئے۔ ہر دم یادِ خدا میں مستغرق۔ طبیعت میں نہ شوخی رہی نہ خوشی کی رمق۔ مزاج میں غم بس گیا تھا، الم رچ گیا تھا۔

تایا حضور نے جب دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو کسی اور عالم میں جا کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ آنے والے واقعات کی خبر دید بیتے تھے۔ پیشگوئی میں درک رکھتے تھے اور خوابوں کی تعبیر میں تو انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس کم فہم نے ان سے تعبیریں سُن کر ایک تعبیر نامہ مرتب کر لیا تھا۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر تھوڑا نقل کرتا ہوں:

انجیر کا پتہ دیکھنا:

باعثِ پریشانی ہے۔ اندیشہ کی نشانی ہے۔

اناج خشک کھانا:

مفلسی میں مبتلا ہووے، رنج کا سامنا ہووے۔

اونچی جگہ سے اترنا:

عہدہ جاتا رہے۔ غم و غصہ کھاتا رہے۔

آندھی دیکھنا:

ملال بیش ہووے۔ فتنہ و فساد پیش ہووے۔

بلبل دیکھنا:

حاکم سے نفع کی دلیل ہے مگر قلیل ہے۔

پیسہ پڑا پانا:

غم کی نشانی ہے۔ نہایت پریشانی ہے

پھول دیکھنا:

کسی گل رو پر عاشق ہووے ۔ مبتلائے فعلِ فاسق ہووے۔

پستان دیکھنا :

دل شاد ہووے۔ اولاد ہووے۔

پیاسا آپ کو دیکھنا :

حرص بڑھے ۔ نیک کاموں میں خلل پڑے۔

حقہ پینا :

معشوق سے ہمکلام ہووے۔ غم سے نجات پاوے۔

شتر بے مہار دیکھنا :

بدکاری کرنے میں بے باک ہووے۔ آخر غمناک ہووے۔

طاؤس دیکھنا :

عشق میں مبتلا ہووے۔ جنون کا سامنا ہووے۔

ہنسنا :

غم کی دلیل ہے مگر قدرے قلیل ہے۔

تایا حضور نے اپنی موت کی خبر بھی پہلے ہی دیدی تھی۔ ایک روز پہلے گریہ کیا، پھر تبسم فرمایا۔ ابا حضور نے سبب گریہ اور تبسم کا پوچھا تو فرمایا کہ جانِ برادر۔ رویا میں خلقت کے لیے آنے والی آفت کا تصور کر کے اور متبسم ہوا یہ جان کر کہ وصال کا وقت اب قریب آن پہنچا ہے۔ ابا حضور نے استفسار کیا کہ یہ آپ نے کیونکر جانا۔ فرمایا کہ جانِ برادر، پہلی بات میں نے اس طور جانی کہ رات خواب میں دیکھا کہ آندھی کے جھکڑ چلتے ہیں۔ تناور درخت گرتے ہیں۔ دوسری خبر اس طریق سے پائی کہ آج صبحدم میں سورج کی سمت منہ کر کے کھڑا ہوا اور آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو دھیان میں لایا۔ دیکھا کہ تن سے ہمارے سر غائب ہے۔ یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ پھر چہرے پر ملال کی کیفیت طاری ہوئی۔ تامل کیا،

پھر گویا ہوئے کہ جانِ برادر، یہ سر تو ویسے ہی وبال بنا ہوا تھا۔ تن سے جدا ہو گیا تو خوب ہوا۔ مگر کونسی گھڑی آنے والی ہے کہ جس روشن ضمیر کو دھیان میں لاتا ہوں تن سے اس کے سر جدا دیکھتا ہوں۔ بعد اس کے آپ نے تین بار فرمایا: "افسوس، افسوس، افسوس"۔

"اے بیٹے، رات کو تم سوئے نہیں تھے؟"

میں نے ہڑبڑا کر بوجان کو دیکھا کہ جانے کس وقت میرے قریب آن کھڑی ہوئی تھیں میں نے تذکرے کے اوراق الگ رکھے:

"بوجان، آج ذرا جلدی آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ یہاں جان کے تذکرے کے جو اوراق پڑھنے سے رہ گئے تھے انہیں نبٹا دوں"۔

"بیٹے۔ رات کے کہیں بیچ میری آنکھ کھلی تھی اس وقت بھی تم جاگ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے تمہارے جاگنے کی عادت چھٹی تھی۔ اب پھر تم نے وہی طور پکڑ لیا"۔ یہ کہتے کہتے بوجان باہر برآمدے میں نکل گئیں۔ وضو کیا۔ پھر نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

بوجان دوبارہ میرے پاس اس وقت آئیں جب میں ناشتہ کرتے کرتے اخبار پڑھنے میں غرق ہو گیا تھا:

"اے ہے، اخبار نہ ہوا بلائے جان ہو گیا۔ کیوں چائے کو ٹھنڈا کر رہے ہو؟"

میں نے اخبار سے ذرا نظر ہٹا کر سامنے رکھی چائے کی پیالی پر نظر ڈالی۔ پیالی منہ سے لگائی۔ واقعی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"اور آج تم اپنی چڑیوں کو بھی بھول گئے۔ غریب بچے کے انتظار میں سوکھ رہی ہیں"۔

ہاں واقعی، چڑیاں تو میرے ذہن سے آج اتر ہی گئی تھیں۔ فوراً اخبار الگ رکھ دیا۔ توس کے بچے ہوئے ٹکڑے جلدی جلدی ریزہ کیے اور آج توس کے ٹکڑے زیادہ ہی بچ گئے تھے۔ ایک توس تو پورا بچ گیا تھا۔ ناشتہ کو طبیعت لے ہی نہیں رہی تھی۔ ریزے لے کر ہارسنگھار کے پاس پہنچا تو چڑیاں جا چکی تھیں۔ ان چڑیوں کے بھی عجیب نخرے تھے۔

ریزے ڈالنے میں جس صبح ذرا تاخیر ہو جاتی وہ اڑ کر جانے کس طرف نکل جاتیں۔ جیسے روٹھ گئی ہوں۔

بس ایک چڑیا پیچھے بھٹکتی رہ گئی تھی۔ وہ تھوڑے تامل کے ساتھ شاخ سے اتر کر آئی۔ چند ریزے چگے مگر کچھ زیادہ شوق کے ساتھ نہیں۔ پھر وہ بھی اڑ گئی۔

۱۰

"دروازے پہ کوئی ہے"۔ یہ کہنے کے ساتھ ساتھ میں نے گھنٹی کی آواز پر کان لگائے۔ کچھ ایسا گمان ہوا تھا کہ کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی ہے اور میں نے اس توقع پر کان لگائے کہ اگر کوئی ہے تو پھر گھنٹی بجائے گا مگر پھر کوئی آواز ہی نہیں آئی۔

"کوئی بھی نہیں ہے"۔ زبیدہ بولی۔ "کوئی ہوتا تو دروازے کی گھنٹی بجاتا"۔

"میرا خیال ہے کہ کسی نے بجائی تھی"۔

"مجھے تو سنائی نہیں دی تھی۔ تمہارے تو کان بجتے ہیں"۔

میں تھوڑا کھسیانا ہو کر چپ ہو گیا۔ آگے دھری ہوئی پیالی اٹھائی اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ مگر اندر ایک خلش سی تھی کہ کیا واقعی کوئی نہیں تھا اور کیا واقعی کسی نے گھنٹی نہیں بجائی تھی۔ پھر مجھے یہ کیسے گمان ہوا۔ کیا یہ محض وہم تھا۔ مگر پھر میں نے جلد ہی اس خلش کو رفع دفع کر دیا۔ یہ سوچ کر کہ آخر یہ کونسا ایسا بڑا ایشو ہے۔ نہیں ہو گا کوئی میرا وہم ہو گا۔ اور ایسا وہم ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ یوں بھی تو ہوتا ہے کہ کوئی آس پاس نہیں ہوتا اور لگتا ہے کہ تمہیں کسی نے پکارا ہے، تمہارا نام لیا ہے۔ تو کیا عجب ہے کہ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ تو اس طرف سے ذہنی فراغت کے بعد میں نے اطمینان سے چائے ختم کی، سگریٹ سلگائی۔ زبیدہ چائے کی ٹرے لے کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

اب شام ہو رہی تھی۔ میں اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ سگریٹ پیتے پیتے

بس یونہی ایک رَو میرے اندر اٹھی کہ ممکن ہے کوئی آیا ہی ہو کہ گھنٹی کی آواز تو میرے کان میں آئی تھی مگر کون تھا وہ؟ اور اس آن مجھے اس شخص کا خیال آیا جو شام کے جھٹپٹے میں میرے پاس سے گذرا تھا ایسے کہ میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا اور جس کا خیال اس سناٹی رات میں میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ وہ شخص ایک مرتبہ پھر میرے تصور میں زندہ ہو گیا۔ تو کیا وہی شخص آیا تھا؟ مگر اس طرح کیوں آتا ہے؟ آنے کا اچھا وقت چنا ہے اور کیا خوب طور اپنایا ہے کہ شام کے جھٹپٹے میں آکر دروازے پر دستک دیتا ہے اور کتنی آہستگی سے دستک دیتا ہے کہ میں شک میں پڑ جاتا ہوں کہ کسی نے دستک دی بھی ہے یا نہیں اور پھر دم کے دم میں اڑنچھو ہو جاتا ہے۔

اب میں پچھتا رہا تھا کہ فوراً جا کر دروازے پر دیکھا کیوں نہیں؟ پھر زبیدہ پر غصہ آیا کہ اس نے بے سوچے سمجھے فوراً ہی میری بات کی تردید کر دی۔ خود پر بھی جھنجھلاہٹ ہوئی کہ میں نے زبیدہ کی بات کیوں مان لی۔

"ایک بات بتاؤں۔ آج میں نے فال نکلوائی تھی۔" زبیدہ نے واپس آکر قریب بیٹھتے ہوئے کچھ رازدارانہ سے لہجے میں اطلاع دی۔

"وہ کس سلسلہ میں؟" میں نے چونک کر زبیدہ کو دیکھا۔

"آشیانے کے سلسلہ میں۔" زبیدہ تھوڑا ہچکچائی۔ پھر بولی: "فال میں نکلا ہے کہ یہ زمین تمہیں راس نہیں آئی..... بیچ ڈالو۔"

"کیا؟" میں کچھ بوکھلا گیا۔

"فال میں تو یہی نکلا ہے۔"

یہ بات اتنی اچانک تھی کہ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہوں۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو جمع کیا، کہا: "زبیدہ، سنو۔ میں تو اس جھنجھٹ میں پڑا ہی نہیں رہا تھا۔ تمہاری ضد تھی کہ مکان اپنا ہونا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے کہ کن مصیبتوں سے پلاٹ حاصل کیا۔ پھر کیا کیا

جتن کر کے مکان بنوایا۔ اس کے قرضے ابھی تک جان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔"

"یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر مکان تمہاری جان سے زیادہ پیارا تو نہیں ہے۔"

"میری جان سے پیارا؟ میری جان تو اس کے لیے جتنی گھلنی تھی گھل چکی۔ اب یہ مکان میری جان کو کیا کہتا ہے؟"

"خیر میں نے تو فال میں جو نکلا تھا وہ بتا دیا۔"

"تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ مکان جو اتنی مصیبتوں سے بنا ہے بیچ ڈالنا چاہیے۔"

میں نے چڑ کر کہا تھا اور زبیدہ نے کس سکون کے ساتھ جواب دیا: "مکان جان سے زیادہ تو نہیں ہے۔ کمانے والے ہاتھ سلامت رہیں مکان تو اور بھی بن سکتا ہے۔"

اتنے میں بوجان برآمد ہوئیں۔ میں نے فوراً ان کے سامنے مقدمہ پیش کر دیا: "بوجان۔ آپ نے سنا۔ زبیدہ کی تجویز یہ ہے کہ آشیانہ بیچ دیا جائے۔"

"ہاں۔ سن چکی ہوں۔" بوجان نے بگڑے لہجے میں کہا اور اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ زبیدہ بوجان سے یہ ذکر پہلے ہی کر چکی ہے اور بوجان اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکی ہیں۔ بوجان تھوڑا چپ ہوئیں پھر زبیدہ سے مخاطب ہوئیں:

"اے دلہن۔ ہوش کی دوا لو۔ مکان کوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہے کہ آج بنایا کل بیچ دیا۔ بی بی مکان تو آم کا پیڑ ہوتا ہے۔ نسلیں پھل کھاتی ہیں۔ خیر سے سہاگ بنا رہے۔ آج تم دو ہو کل اللہ چاہے تو تین ہو جاؤ گے اور پھر تین سے چار ہوں گے۔ ٹبر کو کہاں لیے لیے پھرو گی؟"

"اور گھر بنا لیں گے۔"

"اور گھر بنا لیں گے"۔ بوجان نے کتنا منہ بگاڑ کر کہا "دلہن، مکان زندگی میں ایک مرتبہ بنتا ہے پھر پشتوں چلتا ہے۔ ہماری چراغ حویلی پانچ پشتیں پہلے بنی تھی۔ اللہ رکھے اس نے پانچ پشتیں دیکھیں اور ابھی تو اسے اور پشتیں دیکھنی تھیں۔ حویلی تو کھڑی تھی۔ حویلی والے ہی اکھڑ گئے۔"

"بو جان، خوشی سے تو میں نے یہ بات نہیں کہی۔ فال میں جو نکلا ہے وہ میں نے کہا ہے۔"

"اے دلہن کیسی باتیں کرتی ہو۔ فال نکالنا ہرا یرا غیرا کا تو کام نہیں ہے۔ کسی ٹٹ پونجیا مولوی سے تم نے فال نکلوائی اور یقین کر لیا۔ ارے فال ہی نکلوانی تھی تو مولوی غلام رسول سے نکلواتیں۔ اور میں تو کہوں ہوں کہ انہیں بلوا کے کہا جائے کہ گھر کو کیل دو۔ بس پھر گھر محفوظ ہے۔"

پھر وہی گمان کہ جیسے دروازے پہ کوئی ہے جیسے کسی نے گھنٹی بجائی ہے۔ میں نے چائے پیتے پیتے سامنے بیٹھی زبیدہ پر ایک نظر ڈالی۔ اسے دیکھ کر تو نہیں لگتا تھا کہ اس نے کچھ سنا ہے۔ زبیدہ اونچا سننے لگی ہے یا سنی اَن سنی کر دیتی ہے۔ خیر میں زیادہ اس سوال سے نہیں الجھا۔ سوچا کہ اٹھ کر دیکھ ہی لو۔ کیا خبر ہے کوئی ہو۔ نہ بھی ہو تو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کم از کم شک تو رفع ہو جائے گا۔ کل کی شام مجھے یاد تھی۔ ایک ذرا سی اکساہٹ کی وجہ سے کتنے شکوں میں گرفتار ہو گیا تھا۔ چائے بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اخلاق یہ تمہاری کیا بُری عادت ہے کہ چائے بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہو۔"

"جا کہیں نہیں رہا۔ ابھی آتا ہوں۔"

کس تیزی سے میں دروازے پر آیا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی آیا بھی تھا، یا محض میرا وہم تھا۔ اگر آیا تھا تو کیا خالی دہلیز چھونے آیا تھا۔ گھنٹی بجائی اور چلتا ہو گیا۔ محض اپنے اطمینان کے لیے میں نے دروازے سے نکل کر بیچ گلی میں کھڑے ہو کر اس کی آخری حد تک نظر ڈالی۔ گلی یہاں سے وہاں تک خالی۔ مگر جب مڑ کر اندر جانے لگا تو میں نے گلی کے آخری کنارے پہ ایک ہیولی دیکھا جیسے کوئی گلی سے نکل کر سڑک پر مڑ گیا ہے۔ دیکھا یا ایسا

لگا کہ دیکھا ہے۔ فیصلہ نہیں کر پایا کہ سچ مچ کسی کو دیکھا تھا یا شک ہوا تھا۔ سوچا کہ آگے بڑھ کر دیکھ لیتے ہیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا گلی سے نکلا اور سڑک پہ ہو لیا۔ سڑک پہ نظر دوڑائی کہ کہاں گیا وہ۔ چند قدم کے فاصلے پر پان سگریٹ کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں ایک شخص اطمینان سے کھڑا کوکا کولا پی رہا ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ یا ممکن ہے مجھے نہ دیکھ رہا ہو کہ میرا احساس ہو کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ دم بھر کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں یہی تو وہ آدمی نہیں ہے۔ اس خیال کے ساتھ میں مڑ کر احتیاط سے اس کا جائزہ لینا چاہتا تھا مگر میں نے سوچا کہ اسے مجھ پہ ایسا کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے اسے شناخت کر لیا ہے۔ تھوڑا آگے جا کر واپس آؤں گا اور سادگی سے ایسے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے اس پر نظر ڈالوں گا۔ اگر وہی ہے تو میں اسے کسی نہ کسی طور تاڑ لوں گا۔ لیکن ابھی میں چند قدم بڑھا تھا کہ میں نے دیکھا کہ میرے آگے آگے ایک چوڑا چکلا آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جا رہا ہے جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس نے چال سست کی تو میں اسے جا لوں گا۔ میں نے فوراً ہی اپنی چال تیز کر دی لیکن وہ تو اتنے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا کہ میری چال میں تیزی آجانے کے باوجود میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آگے چوراہا تھا۔ چوراہے پر میرے پہنچتے پہنچتے وہ سڑک کو عبور کر چکا تھا۔ اور بتی سرخ ہو چکی تھی۔ مجھے ٹھہرنا پڑا۔ بتی کا رنگ بدلتے ہی میں نے تیزی سے سڑک کو عبور کیا اور نگاہ دوڑائی کہ وہ کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مگر یہاں سڑک پہ اتنا مجمع تھا کہ خدا کی پناہ۔ لگتا تھا کہ جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہے یا کوئی مجرم پکڑا گیا ہے۔ میں حیران کہ یا اللہ اس سڑک پہ آج اتنی خلقت کہاں سے امنڈ پڑی۔ یہ معروف سڑک بے شک تھی مگر اتنی بھیڑ تو یہاں نہیں ہوا کرتی تھی۔ مگر میں یہ جاننے کے لیے کہ ہوا کیا ہے، رک نہیں سکتا تھا۔ یہ جو فکر تھی کہ کہیں وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

بھیڑ بھڑ کا پیچھے رہ گیا۔ اب سڑک خالی اور خاموش تھی۔ خاموش سی خاموش جیسے

ہُو کا عالم ہو۔ بس جیسے میں خالی ڈھنڈار کسی بستی میں چل رہا ہوں۔ مگر وہ کہاں گیا۔ دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ وہ تو کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کیا، وہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا۔ سڑک سے ہٹ کر ایک گلی میں مڑ گیا۔ بس شک سا تھا کہ وہ میری نظروں سے بچنے کی غرض سے کسی گلی میں مڑا ہے۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ ہر گلی خالی ہر گلی خاموش۔ میں حیران کہ یہ گلیاں تو میری دیکھی بھالی ہیں۔ اتنی اجنبی کیوں نظر آرہی ہیں، اور اتنی بے آباد کیوں دکھائی دے رہی ہیں۔

کتنی مرتبہ اپنے ہی قدموں کی چاپ پر چونکا۔ کتنی مرتبہ شک ہوا کہ کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے آرہا ہے۔ مگر کون؟ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ وہ میرا پیچھا کیوں کرے گا۔ مگر کیا خبر ہے؟

تھک ہار کر واپس ہو لیا۔ اپنے گیٹ میں قدم رکھا تو سامنے برآمدے میں کوئی بیٹھا نظر آیا۔ وہ؟ وہ یا کوئی اور۔ بہرحال کوئی اجنبی تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔

"فرمایئے"۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ اپنا مکان بیچنا چاہتے ہیں؟"

"جی"۔ میں چکرا سا گیا۔

"جی بات یہ ہے کہ میں پراپرٹی ڈیلر ہوں"۔ ذرا اس نے اپنی حیثیت کی وضاحت کی۔ "میں نے آج آپ کو دفتر میں بھی فون کیا تھا۔ دو مرتبہ فون کیا اور دونوں مرتبہ آپ نہیں ملے"۔

مجھے یاد آیا کہ چپراسی نے مجھے بتایا تھا کہ کسی نے آپ کو فون کیا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی یہ سوچ کر کہ ہوگا کوئی؟ اب کون ایسا فون کرنے والا ہے جس کے لیے میں تردّد کروں۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا: "اچھا اس سے پہلے بھی آپ یہاں آئے تھے"۔

"جی" اب پراپرٹی ڈیلر کے سٹپٹانے کی باری تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کل بھی آئے تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے"۔

"نہیں"۔ وہ چکرا سا گیا۔

"اچھا کمال ہے۔ وہ آپ نہیں تھے۔ پھر کون تھا؟" میں یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔

مگر شاید اس شخص کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ سادگی سے بولا: "وہ کوئی اور ہوگا۔ مجھے تو آج ہی پتہ چلا تھا کہ آپ مکان بیچ رہے ہیں۔ پہلے میں نے دفتر میں آپ سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہاں نہیں ہو سکا تو یہاں حاضر ہو گیا۔ اندر سے جواب آیا کہ آپ دفتر سے تو آگئے ہیں، یہیں کہیں ہیں۔ میں نے سوچا تھوڑا انتظار کر لیا جائے"۔

"آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے کہ میں مکان بیچ رہا ہوں"۔

"اچھا؟ پھر تو مجھے آپ سے معذرت کرنی چاہیے کہ خواہ مخواہ میں نے آپ کا وقت لیا"۔

"کوئی بات نہیں"۔

وہ تو چلا گیا مگر میں حیران تھا کہ کل ہی تو گھر میں یہ بات ہوئی ہے۔ پراپرٹی ڈیلر کے کانوں تک کیسے پہنچ گئی۔ میں نے زبیدہ سے پوچھا: "پراپرٹی ڈیلر کو کس نے اطلاع دی تھی کہ ہم مکان بیچ رہے ہیں؟"۔

"پراپرٹی ڈیلر کو؟ ..... اچھا ..... تعجب ہے ..... یہ آدمی کون تھا؟"

"پراپرٹی ڈیلر تھا۔ تم نے کسی سے ذکر کیا ہوگا؟"

"کسی سے نہیں۔ کل گھر ہی میں یہ بات ہوئی تھی۔ کیا کہتا تھا وہ؟"

"پوچھنے آیا تھا کہ آپ مکان بیچ رہے ہیں۔ نہیں بلکہ اس اعتماد کے ساتھ آیا تھا کہ یہ مکان بکنے لگا ہے اور اسے اس کا سودا کرانا ہے"۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ ہم مکان ایسے تھوڑا ہی بیچ دیں گے" آنکھیں بند کر کے

پھر کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہہ دیا کہ تمہیں غلط اطلاع ملی ہے"۔

"اچھا کیا"۔ پھر رک کر بولی۔ "مگر ذرا ٹٹولتے تو سہی کہ کیا کہتا ہے"۔

"جب ہمیں گھر بیچنا ہی نہیں ہے تو اسے ٹٹولنے اور بات کو آگے بڑھانے کی کیا تک تھی؟"

"ذرا پتہ تو چلتا کہ وہ کیا قیمت لگاتا ہے"۔

"کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ پراپرٹی ڈیلر سے بات کر کے تو آدمی پھنس جاتا ہے۔ تم نہیں جانتیں۔ میں اس مخلوق کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ مخلوق تو وہ ہے کہ ایک مرتبہ مردت میں بھی اس سے بات کر لو تو وہ لیس ہو جاتی ہے"۔

میں نے یہ بات یونہی تھوڑا ہی کہی تھی۔ میرے ساتھ گذر چکی تھی۔ یہ تب کا واقعہ ہے جب میرے پاس گاڑی تھی۔ عجب کھٹ بگڑی گاڑی تھی۔ چلتے چلتے بلاسبب اڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ پھر میں جس تس کا منہ تکتا۔ گذرتی ہوئی ٹیکسیوں کو رکنے کے اشارے کرتا۔ کوئی اللہ کا بندہ ٹیکسی والا رحم کھا کر ٹیکسی روکتا۔ گاڑی کھول کر اس کے کل پرزے دیکھتا بھالتا، درست کرتا اور پھر میں وہاں سے چلنے کے قابل ہوتا۔ ایک روز جب سخت دوپہر تھی اور میں سڑک کے کنارے پسینہ میں شرابور کھڑا تھا تو ایک ٹیکسی والے نے میری گاڑی کے ڈانگو کا جائزہ لیتے لیتے کہا:

"صاب، آپ اس گاڑی کو بیچ ہی ڈالیں۔ نئی خرید لیں۔ آجکل شراڈ کا نیا ماڈل آیا ہوا ہے بہت اچھی گاڑی ہے"۔

جواب میں میں نے پیشانی اور گردن سے پسینہ پونچھا اور "ہوں" کہہ کر چپ ہو رہا۔ دل میں کہا کہ کہتا تو سچ ہے مگر اسے یہ پتہ نہیں کہ میں اس گاڑی کے ساتھ اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالوں تو شراڈ خریدنے کی استطاعت پیدا نہیں کر سکتا۔

تیسرے دن ایک شخص جسے میں بالکل نہیں جانتا تھا، فوراً میرے پاس آیا اور کہنے لگا: "میرے پاس آپ کی گاڑی کے لیے ایک گاہک ہے۔ معقول اسامی ہے۔ آپکو اچھے پیسے مل جائیں گے۔"

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا:

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں بس یہی موٹروں میں ڈیل کرتا ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں آپ جس ورکشاپ سے اپنی گاڑی ٹھیک کراتے ہیں اس کا مالک میرا جاننے والا ہے۔ بہت آپ کی تعریف کرتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر فی الحال تو میں اس گاڑی کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"اچھا۔" وہ چپ ہوا۔ پھر بولا: "خیر جب بھی آپ کا ارادہ ہو آپ مجھ سے بات کریں۔ میں آپ کا اچھا سودا کراؤں گا۔" یہ کہتے کہتے اس نے جیب سے اپنا تعارفی کارڈ نکالا اور مجھے پکڑا کر چلا گیا۔

ایک ڈیڑھ مہینے بعد پھر آن دھمکا۔ اب زیادہ اعتماد سے ملا: "تو آپ نے فیصلہ کر لیا گاڑی بیچنے کا؟"

"کون کہتا ہے۔ میں نے تو کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا۔"

"اچھا کمال ہے۔ میں نے تو یہی سنا تھا۔"

"کس سے سنا تھا؟"

اس سوال کو وہ گول کر گیا۔ زحمت دینے کی معذرت کی اور چلا گیا۔

ڈیڑھ دو مہینے بعد پھر آیا۔ اب کے تو بہت ہی بے تکلفی سے ملا جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔ میں نے چائے کے لیے پوچھا۔ بولا:

"کوئی مضائقہ نہیں۔"

ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کاروں کے نئے ماڈلوں کی تفصیل بتاتا رہا۔ پوچھنے لگا:

"آپ کے پاس یہ گاڑی کب سے ہے؟"

"یہی دو تین سال سے۔"

"اچھا۔ دو تین سال میں اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں آپ نے کس کے ذریعہ یہ سودا کیا تھا۔ مجھ سے آپ کی ملاقات ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو اچھی گاڑی دلاتا۔ آپ کے قریب ہی سیٹ لائف کا دفتر ہے وہاں صدیقی صاحب ہوتے ہیں۔ انہیں میں نے اب سے چھ سال پہلے فوکس ویگن دلائی تھی۔ بالکل کوڑیوں کے مول۔ صاحب آج تک اس گاڑی نے ورکشاپ کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ صدیقی صاحب میرے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔"

"سیکنڈ ہینڈ گاڑی اور ورکشاپ نہ جائے۔ تعجب ہے۔"

"جناب یہی تو اپنا کمال ہے۔ جب بھی آپ کا ارادہ بنے آپ مجھ سے بات کریں۔ ویسے آپ کا ماڈل بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اسے نکال ہی ڈالیں۔ اس وقت نکال دیں گے تو اچھے پیسے مل جائیں گے۔ تھوڑے دن کے بعد اسے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

وہ کہتا رہا۔ میں سنتا رہا۔ ہاں ناں میں کوئی جواب نہیں دیا اس نے بھی میرا ردِ عمل جاننے کے بارے میں کوئی تردد نہیں دکھایا۔ چائے پی، ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

مہینہ نہیں گذرا تھا کہ ایک گاہک کو ساتھ لے کر آ گیا:

"انہیں آپ ذرا اپنی گاڑی دکھا دیں۔"

"کس سلسلہ میں؟"

"بس دکھا دیں۔"

"میں گاڑی بیچ تو نہیں رہا۔"

"بیچنے کو کون کہہ رہا ہے۔ مگر میں انہیں آپکی گاڑی دکھانا چاہتا ہوں۔"

میں کسی قدر تامل کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور دفتر سے باہر آ کر انہیں اپنی

گاڑی کے پاس لا کھڑا کیا۔ اس شخص نے اس نووارد کو گاڑی بہت تفصیل سے دکھائی تعریف کی، زور اس پہ دیا کہ گاڑی کا انجن بالکل درست حالت میں ہے اور اصل چیز تو انجن ہوتا ہے۔

یہ ساری باتیں کر کے اس نے مجھے چابیاں لوٹائیں، رخصت کے لیے ہاتھ ملایا پھر نووارد سے کہا: "آیئے چلتے ہیں۔"

جاتے جاتے میرے کان میں کہہ گیا: "پیسے والی اسامی ہے۔ اسے گنوانا نہیں ہے۔"

میں نے تو مروّت میں گاڑی دکھا دی تھی۔ مگر آدمی ایک دفعہ مروّت میں آجائے تو پھر آتا چلا جاتا ہے۔ اس کار ڈیلر نے مروّت ہی مروّت میں مجھ سے فروخت کے سارے مراحل طے کرائے اور اس خوش اسلوبی سے کہ آخر وقت تک مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ گاڑی کا سودا ہو رہا ہے۔

"پھر تو اچھا کیا تم نے اسے صاف جواب دے دیا لیکن اگر کبھی وہ تمہارے پیچھے آجائے تو میں کیا کہوں"۔ زبیدہ نے ایک نیا سوال اٹھا دیا۔

"میرے پیچھے آجائے"۔ میں چونک پڑا۔ ایک مرتبہ پھر سویا ہوا شک میرے اندر جاگا کہ کہیں یہی تو وہ آدمی نہیں ہے جو..... "کیا یہ آدمی کبھی پہلے بھی آیا تھا؟"

"نہیں۔ بس مجھے یونہی خیال آیا کہ اگر اسے یہ خیال ہے کہ ہم آشیانہ بیچ رہے ہیں تو یہ نہ ہو کہ روز آن کھڑا ہو۔"

"کیسے آن کھڑا ہوگا۔ بس اسے منہ نہیں لگانا ہے۔"

زبیدہ نے تامل کیا۔ پھر بولی:

"ہاں اگر ہم آشیانہ نہیں بیچ رہے ہیں تو پھر تو اسے منہ نہیں لگانا چاہیے۔ لیکن اگر بیچ رہے ہیں تو....."

پتہ نہیں زبیدہ کیا کہنا چاہتی تھی، میں نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی: